اسلامی معاشرے میں مسجد کا مقام

ڈاکٹر احمد امین مصری ——— ترجمہ: محمد نذیر کاکا خیل

خوش نصیبی سے میری ملاقات ایک انگریز عالمہ و فاضلہ خاتون سے ہوئی۔ اس وقت میری تمام تر توجہ ثانوی مدارس میں اخلاق و تربیت کا پروگرام مرتب کرنے پر لگی ہوئی تھی۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرنے والوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر ہی اپنی گفتگو کو اپنے دماغ میں کارفرما افکار و خیالات سے رنگ دیتے ہیں اور گفتگو کرنے والا خواہ اپنے دماغ پر چھائے ہوئے موضوع سے کتنا ہی دور ہٹ جائے، تیزی سے اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ کر اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔

ہماری بھی کچھ یہی حالت تھی۔ ہم نے آغازِ گفتگو تو موسمیات سے کیا پھر دوسرے موضوع لے لئے اور بالآخر جس موضوع پر پہنچے وہ تھا اخلاقی تعلیم و تربیت اور اس سے متعلقہ مسائل۔ میں نے محترمہ سے سوال کیا —"انگلستان میں ثانوی مدارس میں اخلاق و تربیت کا کیا پروگرام ہوتا ہے؟"۔ انھوں نے مجھے بتایا:"اس سلسلہ میں وہاں کے مدارس میں نہ تو کوئی معین پروگرام ہوتا ہے اور نہ ہی خصوصی اسباق — البتہ مختلف موقعوں پر اس موضوع سے متعلق خطبات کا انتظام کیا جاتا ہے جسے بجالانے میں کنیسہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کنیسہ کے منتظمین یہ ذمہ داری سنبھالتے ہیں اور ان کی طرف سے اس موضوع پر بچوں اور جوانوں کے لئے اسباق کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ہمیں مدارس کے اسباق میں اس موضوع پر کسی تعلیم کی تکلیف دینے سے بچا لیتے ہیں۔ کنیسہ میں اس تعلیم کے دیئے جانے کا نہ صرف نہایت خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ بلکہ اس طریقے سے اس کا احترام بڑھتا اور لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔"

کنیسہ سے میرا ذہن بجلی کی سی تیزی سے اپنے ہاں کی مسجد کی طرف منتقل ہو گیا اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا،"وہ کون سی اجتماعی خدمت ہے جو مسجد ملتِ اسلامیہ کے لئے بجالا سکتی ہے؟"

میری نظر میں محلّے کی مسجد کی سب سے اہم خدمت، دینی خدمت کے ساتھ ساتھ اجتماعی خدمت ہے وہ اس طرح کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق مختلف موضوعات پر مسجد کی نگرانی میں لکچرز کا انتظام کیا جائے اور ان مشکلات کا حل ڈھونڈا جائے جو ہر زمانہ میں پیش آتی ہیں۔ اس کی خدمت یہ بھی ہے کہ محلے کی اجتماعی حالت کی نگرانی کرتے ہوئے اہلِ محلہ کے فقر وافلاس کا تدارک اور دیگر مشکلات ومصائب کا سدِ باب کرے، غریبوں اور مالداروں کے درمیان رابطہ پیدا کر کے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک اور عوامی مفاد کے لئے کام کرنے کی ترغیب دے۔ اسی طرح مختلف خاندانوں کو جو داخلی الجھنیں اور دشواریاں درپیش ہوتی ہیں یا ان میں جو معاشرتی خرابیاں رونما ہوں، ان کو دُور کرے۔

میری نظر میں محلّے کی مسجد محلّے کے شفاخانے کی طرح ہے دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ شفاخانے میں جسمانی امراض کا علاج ہوتا ہے جب کہ مسجد میں روحانی اور اجتماعی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ مسجد کا امام شفاخانے کا ناظم ہے جو محلے کے مریضوں کو پہچانتا ہو اور ان کا علاج بھی اس کے پاس ہو۔ وہ محلے کے لوگوں کے درمیان جان پہچان اور رابطہ کا ایک ذریعہ ہو۔ مالداروں سے (زکوٰۃ و صدقات) لے کر غریبوں میں تقسیم کرتا ہو۔ اسی طرح تندرست سے (امداد) لے کر مریض کو دیتا ہو۔ اس کا یہ کام بھی ہوتا ہے کہ اپنی بساط کے مطابق باہمی تنازعات کا تصفیہ کرے، بے ادبوں کو ادب سکھلائے۔ محلے کے مہذب لوگوں کو اپنا یار ومددگار بنائے تاکہ وہ سب مل کر اس کی مہم کو تیز تر کرنے میں خطبات و وعظ کے ذریعہ اس کی مدد کرتے رہیں۔ انھیں مہذب وتعلیم یافتہ بنائیں۔ اس طرح محلے کے لوگوں کو شعور ہو جائے گا کہ مسجد ضروریاتِ زندگی میں سے ایک اہم ضرورت ہے یہ وہ خدمت انجام دیتی ہے جس کے لئے مدرسوں، عدالتوں اور خیراتی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے (بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس (مسجد) کا دائرۂ کار اس سے بھی وسیع تر ہے۔

اگر مرد کے لئے مسجد میں تعلیم وتربیت کا انتظام ہو سکتا ہے تو عورت کو اس سے کیوں محروم کیا جائے؟ ہر محلے کی مسجد میں خواتین کے لئے ان کی سہولت کے مطابق مقررہ وقت میں دین ودنیا کے واجبات کی تعلیم دی جائے اور ان کو دینی اور دنیوی اُمور سے آگاہ کیا جائے تاکہ انھیں خانگی معاملات احسن انداز پر انجام دینے کا طریقہ معلوم ہو اور اس طرح ان میں نیکی اور خدمتِ خلق کے جذبات کی تربیت ہو سکے۔

اس وقت عورت روحانی اور دینی غذا سے اس لئے محروم ہے کہ وہ مسجد سے دُور ہے اسے بلاوجہ اس کے ایسے حق سے محروم کر دیا گیا ہے جو اس کے لئے ہر قسم کی تکلیف کے موقع پر باعثِ تسکین تھا، جس سے اس کے جذبات کی سیرابی اور روحانی غذا مہیا ہوتی تھی۔ جب عورت کو مسجد کی سرگرمیوں سے دُور کر دیا گیا تو اس کے بچے بھی دینی جذبہ سے محروم ہو گئے کیونکہ ماں کی گود بچے کی تربیت گاہ ہوتی ہے اور جب ایک مرتبہ عورت صحیح راستہ سے ہٹ گئی تو پھر اس کو مسجد صحیح راستہ پہ لانے اور اسے اطمینان بخشنے میں ناکام رہے گی۔ عورت اب سرکش اور بے راہ ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کی تمام تگ و دو کا میدان گھر اور کلب (یا سینما) تک محدود ہے لیکن ان دونوں کے درمیان مسجد نہیں ہے جو اس کو خانگی مصروفیات کی کدو۔ت (تھکن) اور کلبوں کی حد سے بڑھی ہوئی لغویات سے محفوظ رہنے کے لئے راہِ اعتدال پر لا سکے۔

یہ ہے مسجد کے بارے میں میرا تصور — اور ہونا بھی یہی چاہیئے کہ مرد اور عورت کی روحانی، اجتماعی اور تعلیمی زندگی پر اس کا اثر قوی ہو، تاکہ اہلِ محلہ کے دل ہر وقت اس میں اٹکے رہیں۔ مسجد کی بدحالی پہ ان کی غیرت جوش مارنے لگے، وہ ہر دم مسجد کے انتظام، صفائی، امامت اور خطابت کی ترقی کے لئے کوشاں رہیں۔ ان کو یقین ہو کہ مسجد ان کے لئے ہے اور وہ مسجد کے لئے۔ وہ یقین رکھیں کہ مسجد کے میناروں سے چہار سو اصلاح کی روشنی پھیل رہی ہے۔ محلے کے اساتذہ تہذیب پھیلانے کے لئے اس کے سپاہی ہوں، مالدار لوگ فقر کے خلاف نبرد آزما ہوں اور محلہ کی خواتین اپنی اولاد کو مسجد کی طرف دعوت دے رہی ہوں۔

یہی مسجد کا صحیح مقام ہے لیکن اب ہماری مسجد ہم سے کتنی دُور ہے اور ہم اس سے کتنے دُور ہو چکے ہیں۔ مسجد لوگوں سے کنارہ کش ہو چکی ہے اور لوگوں نے مسجد کو ایک کنارہ پر چھوڑ دیا ہے۔ مسجد کو لوگوں کے وجود کا شعور نہیں رہا اور لوگوں سے اس کے وجود کا احساس جاتا رہا۔

آثارِ قدیمہ والوں نے ایسی مسجد کو دیکھ کر اسے آثارِ قدیمہ میں شمار کیا۔ اور جب لوگوں نے اس کے نظام پر نظر ڈالی تو اُنہوں نے بھی اسے آثارِ قدیمہ سے زیادہ کچھ نہ سمجھا۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج چند غریبوں، پنشن پانے والے ملازموں یا عوام میں سے چند معمر ترین لوگوں کے سوا مسجد میں جانے کا کوئی قصد نہیں کرتا۔ جہاں تک تہذیب یافتہ

نوجوانوں اور آسودہ حال طبقہ کا تعلق ہے وہ مسجد کے بارے میں نہ تو کبھی سوچتے ہیں اور نہ اس کی زیارت کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اگر (اتفاق سے) وہ اس میں داخل بھی ہو جائیں تو بر استثنائے چند وہ اس کے آداب سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینما اور مسجد نے لوگوں کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا ہے۔ مسجد کے حصے میں آنے والے عمر رسیدہ بوڑھے اور غربا ہیں۔ سینما کے حصے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نیز مال دار لوگ آئے ہیں۔ یہ ایسی صورت ہے جس سے نہ تو کسی خوشگوار مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے اور نہ کسی نیکی کی خوشخبری ملتی ہے۔

انتہا یہ ہے کہ خود وزارتِ اوقاف نے بھی مساجد کو آثارِ قدیمہ ہی میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ائمہ وخطباء کے تقرر اور مساجد کی نگرانی کا وہی صدیوں پرانا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں زمانہ اسی جگہ کھڑا ہے جہاں صدیوں پہلے تھا اور آگے بڑھا ہی نہیں۔

ائمہ اور خطباء بھی اپنی روش سے اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو آثارِ قدیمہ کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ عموماً ایسے خطبات پڑھ کر سناتے ہیں جو گزشتہ صدیوں میں لکھے گئے تھے، یہ خطبے نہ تو روح کو گرماتے ہیں نہ ہمت کو بڑھاتے ہیں۔ ان سب میں اجمالاً "اتقوا اللہ" تو ملتا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں بیان کی جاتی۔ جہاں تک ہمارے جدید مسائل کا تعلق ہے یا ان مشکلات کا جن سے ہم دوچار ہیں، ان کا ان خطبوں میں کوئی دخل نہیں ہوتا، کیوں کہ قدیم مرتب شدہ مجموعوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

حق یہ ہے کہ لوگ بھی مسجد سے ہٹ جانے میں کچھ معذور ہی ہیں۔ بس اگر خطیبوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ لوگوں کو کیسے مخاطب کریں اور دین سکھانے والوں کو علم ہو جائے کہ عوام کے دلوں کو کیوں کر موہ لیا جائے اور لوگوں کو یہ شعور پیدا ہو جائے کہ مسجد میں ان کی روحانی تسکین کے ساتھ دینی و دنیوی

غذا موجود ہے تو حالات یکسر بدل جائیں گے اور مسجد ہر طبقہ کے لوگوں سے کھچا کھچ بھر جائے گی۔

اسلام میں مسجد یہی خدمات انجام دیتی تھی جو ہم نے اُوپر بیان کیں۔ خلفاء اور ان کے نائب اپنے اپنے زمانوں میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں خطبے دیتے (اور مشورے کرتے) تھے، اسی طرح جب وہ میدانِ جنگ میں جاتے یا کوئی اہم مسئلہ در پیش ہوتا تو مسجد ہی میں وہ لوگوں سے خطاب کرتے تھے۔

الغرض مسجد علماء، طلباء، شعراء و ادباء کے لئے مدرسہ کا کام کرتی تھی۔ گویا مسجد میں آنے والوں کے لئے مسجد تعلیم گاہ ہوتی۔ عید، حج اور دوسرے تہواروں کے موقع پر مسجد ہی میں لوگ جمع ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مساجد بڑوں اور بچوں کے لئے مدارس ہوا کرتی تھیں اگر یہ اپنے صحیح راستے پر زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہتیں تو آج تمام مذکورہ بالا اجتماعی خدمات مساجد انجام دیتیں — لیکن ارشاد ربانی کے مطابق:

"سو ان کے بعد ایسے خلف آئے جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی کی۔ جلد ہی یہ لوگ اپنی گمراہی کی سزا پائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور حق کی طرف پلٹ آئے۔"

(قرآن، سورۂ مریم۔ آیت ۵۹ - ۶۰)